پیام اقبال Bahria Research Journal on Iqbal Studies (BRJIS)
1(1), 51-68, 2022

نسل نو کی فکری تربیت: فکرِ اقبال کی روشنی میں تحقیقی جائزہ

Intellectual training of the new generation: a research review in the light of Iqbal's thought

Sabina Awais Awan
Government College University, Sialkot
drsabinaawais97@gmail.com

Abstract

Iqbal was not only a great poet but also a credible thinker as well. He had great association and expectations from his young generation. He was a great leader who worked day and night for national cause. His poetry was based absolutely on a message which revolved around the Muslim nation. He was highly worried about the future and outcomes of Muslim nation. He wrote a big collection of poetry and tried to uplift the conscientious of Muslim world. His poetry included, "*Javed Nama*", "*Abdul Qadir key nam*", "*Shaheen*", "*Zouk-o-shouk*", "*Pyam-i-mashriq*", "*Masjid-i-kurtaba*", "*Saqi Nama*", "*Dua*", "*Navid-i-Subah,*" and "*Tipu sultan ki wasiat*". Iqbal believed on practical approach than mere words. Iqbal tried to boost the energy of young Muslim nation by describing the enlightened picture of their forefathers. Iqbal thought that today's young generation must focus on research instead of blind following. He was of the view that revolution always emerge from the inside of the energetic Muslim which can pave way for truth and reality. Greatness is always won, not bestowed upon. He knew the difficulties of truthful course, but he believed on struggle. Great nation always get energy from research and struggle, it was Iqbal's belief. This article describes the role of Iqbal as a beacon of light for young generation.

Keywords: Iqbal, expectations, young generation, leader, muslim nation, practical approach, *Shaheen*

کلیدی الفاظ: اقبال، عصرِ نو، نوجوان، اولوالعزمی، قومی قیادت، نژادِ نو، شاہین

علامہ اقبال ایک بڑے شاعر، مفکر، دانش ور اور مبلغ بھی تھے۔ در حقیقت اہلِ مشرق کے جذبات و احساسات کی عکاسی اقبال نے بہت دلآویز الفاظ میں کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اقبال کے افکار نہ صرف پوری قوم کے لیے مشعلِ راہ ہیں بلکہ خاص طور پر نوجوانوں کے جذبات و احساسات کی بھرپور عکاسی بھی کرتے ہیں۔

اقبال نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ ایک عالم گیر سیاسی و عمرانی انقلاب کا دور تھا۔ انیسویں صدی عیسوی ختم ہو رہی تھی، لیکن اس کے اثرات ابھی باقی تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدا تھی اور عالمِ انسانی پر جنگ کے مہیب بادل چھا رہے تھے۔ جنگِ عظیم اوّل کے آتشیں لاوے نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جنگِ عظیم کے بادل ختم ہوئے تو ایک طرف تخریب کے ہولناک مناظر تھے اور دوسری طرف ایک عصرِ نو کی تعمیر کے سامان ہو رہے تھے۔ عالمِ انسانی کے اضطراب میں کوئی کمی نہیں آئی تھی کہ عرصہ روز گار پر ایک دوسری عالم گیر جنگ کے سیاہ بادل منڈلانے لگے۔ دوسری عالم گیر جنگ کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں کہ جب شاعرِ مشرق نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

اقبال نوجوانانِ ملتِ اسلامیہ کے پیامبر:

نسلِ نو یا نژادِ نو سے اقبال کے گہرے تعلقات کا اندازہ ان کی فکر، کلام غرض تحریروں سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں نسلِ نو کی سیرت و کردار سازی کے لیے وہی روش اختیار کی گئی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر نوجوان اپنی خودی کو استوار کر سکتا ہے۔ وہ تمام امور جو اقبال اپنے عہدِ نو کے متعلق نوجوانوں سے لینا چاہتے ہیں ان کی شاعری کے مختلف ادوار میں، مختلف مجموعہ کلام میں موجود ہیں۔ یہ تمام خیالات داخلی طور پر ایک مضبوط منطقی اور فکری تعلق میں منسلک ہیں۔ جس کا اظہار کبھی اقبال کی شاعری، کبھی خطبات غرض نثری تحریروں میں ملتا ہے۔ اقبال کو نوجوانوں سے محبت تھی۔ صوفی غلام مصطفی تبسم "علامہ اقبال اور تعلیم و تربیت" میں رقم طراز ہیں:

جب بھی کوئی نوجوان اقبال سے سوال پوچھتا تھا تو اُن کے چہرے پر شگفتگی آ جاتی تھی اور اُن کا لہجہ بدل جاتا تھا اور وہ بڑے جوش و خروش اور ولولے کے ساتھ اس سے باتیں کرنے لگ جاتے اور ہر وہ نوجوان جو کہ ان کی گفتگو سُن کر جاتا وہ ایک تڑپ لے کر جاتا اور اس کو یہ خیال ہوتا کہ مَیں پھر یہاں آؤں گا۔[i]

اقبال کی چار نظمیں ایسی ہیں جن میں اقبال نے براہِ راست اپنے فرزند جاوید اقبال کو مخاطب کیا ہے۔ یہاں جاوید سے مراد بہ ظاہر جاوید اقبال ہیں مگر جاوید کے پردے میں ہر مسلم نوجوان ہے۔ ان نظموں میں نوجوانانِ اسلام کے نام اقبال کا پیغام ایک منطقی ربط بھی رکھتا ہے اور راست گفتگو کا اندازِ تخاطب بھی۔ اقبال کی نظم "جاوید کے نام" جو بالِ جبریل میں شامل ہے۔ ۱۹۳۱ میں جب اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان گئے تو اس وقت جاوید کی عمر کوئی سات برس تھی جاوید نے گراموفون کی فرمائش کی۔ گراموفون تو اقبال نہ لے کر آئے لیکن جاوید کا خط ان کی نظم کی شانِ نزول کا باعث ضرور بنا۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر [ii]

پانچ اشعار پر مشتمل یہ نظم بہ ظاہر اقبال اپنے بیٹے جاوید سے مخاطب ہیں لیکن اگر بہ غور جائزہ لیا جائے تو وہ اس ملتِ اسلامیہ کے تمام نوجوانوں سے مخاطب ہیں۔ اقبال کی دوسری "نظم جاوید کے نام" مجموعہ کلام "بالِ جبریل" میں شامل ہے۔ اگرچہ یہ نظم اقبال نے جاوید کے لیے تخلیق کی اس میں کچھ نصیحتیں ہیں، مشورے ہیں، دعائیں بھی ہیں یعنی اگر بہ غور جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہو گا کہ یہ نظم محض جاوید کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے مخاطب پوری ملتِ اسلامیہ کے نوجوان ہیں۔ تیسری نظم ضربِ کلیم میں شامل "جاوید سے" ہے۔ ان نظموں کا مخاطب بظاہر جاوید

ہے مگر دراصل مراد تمام مسلم نوجوان ہیں خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں آباد ہوں۔

تصورِ شاہین:

اقبال نے شاہین، نئی نسل، نژادِ نو یا اپنے فرزند جاوید اقبال کے تلازمات کے ذریعے دراصل ہر دور اور ہر عہد کے مسلم نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے۔ درحقیقت مستقبل میں آنے والے تمام ادوار کے نوجوان بھی پیغامِ اقبال سے مستفید ہوں گے۔ پیامِ اقبال سے صرف وہی نوجوان منحرف ہو سکتے ہیں جو اپنے ماضی سے تعلق توڑ لیں، حال سے تغافل برتیں اور مستقبل سے بے اعتنائی اختیار کریں۔ اقبال اپنی شاعری میں اپنے "مثالی نوجوان" کو عموماً شاہین کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک مثالی نوجوان میں اقبال جس قسم کے اوصاف دیکھنے کے آرزومند ہیں وہ انھیں شاہین میں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ شاہین اسلامی فقر کے تمام اوصاف سے بہرہ مند ہے۔ اس کے ذکر سے اقبال کی مراد نوجوانوں کی سیرت و کردار ہی ہے۔

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ بیاباں میں
کہ شاہین کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی [iii]

اقبال زوال آمادہ آرام طلب اور جنگ گریز اں مسلمانوں کو جھنجوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ حسب و نسب اور خیالات و افکار کے اعتبار سے شاہینی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور شہِ لولاک کا شاہین ہے۔ اقبال نوجوان نسل میں شاہین کی جو خوبیاں دیکھنے کے خواہاں ہیں ان میں اولین صفت تیز نگاہی ہے دوسری بلند پروازی تیسری خودداری اور چوتھی آشیاں گریزی ہے اقبال کو شاہین اس لیے بھی پسند ہے کیونکہ

> شاہین پرندوں میں خاص مقام رکھتا ہے۔ وہ اپنا گھونسلا نہیں بناتا۔ بڑے بڑے اور اونچے درختوں کی چوٹیوں پر بسیرا نہیں کرتا۔ وہ پہاڑوں کی چٹانوں پر رہتا ہے۔ اتنا اونچا اُڑتا ہے کہ نظروں سے دور ہو جاتا ہے۔ زیادہ وقت

اُڑنے میں صرف کرتا ہے۔ وہ تھکتا نہیں۔ اپنے بچوں کو چیل اور کوے جیسے لالچی پرندوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتا تاکہ وہ ان کی عادتوں کو اپنا نہ لیں۔[iv]

تصورِ خودی:

اقبال کی فکر میں خودی سے مراد ایک ایسا شعور ہے جو خود شناس اور خود آگاہ ہو اور اپنی ذات اور اپنے مقاصد کا احساس رکھتا ہو۔ اقبال اسی کو خودی کہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک زندگی کا اصل محرک اثباتِ خودی کا جذبہ ہے جو انسان کو ودیعت کیا گیا ہے۔ اقبال اپنے نوجوانوں کو سمجھاتے ہیں کہ خیر کے ذریعے اپنی خودی کو استحکام بخشنا چاہیے اور خودی کو مضمحل کرنے والے عناصر شر سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اقبال کے نزدیک اگر ہر مسلمان خودداری، خوداعتمادی، بے نیازی، بلند پروازی، دوراندیشی، جہدِ مسلسل، عملِ پیہم کی دولت سے مالامال ہو جائے۔ اقبال کو یقین ہے کہ ان کی قوم کے نوجوان اگر ایک بار بیدار ہو جائیں تو دنیا کی کوئی قوم ان پر حکمرانی نہیں کر سکتی۔ اقبال کے فلسفہ حیات کا مرکزی نقطہ "خودی" ہے جس کا مطلب شخصی انفرادیت کا احساس، شعورِ ذات اور عرفانِ نفس ہے۔ محمد عبد اسلام خان لکھتے ہیں:

> اقبال نے اپنے جو افکار و خیالات نوجوانوں تک پہنچائے، ان میں فلسفہ خودی بہت اہم ہے، جسے اقبال نوجوان کی زندگی کا جزوِ لاینفک بنانا چاہتے تھے۔ فلسفہ خودی اتنا عمیق ہے کہ اس کی تشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں اور آج بھی اس کی تشریحات تشنگی کا شکار ہیں، کیونکہ یہ فلسفہ زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ حقیقی عمل کا متقاضی ہے۔[v]

تصورِ فقر:

فقر دراصل خودی کا ایک ذیلی اخلاقی وصف ہے۔ فکرِ اقبال میں فقر سے مراد یہ ہے کہ دل کو دنیا سے الگ رکھنا۔ دنیاوی کسی شے سے محبت نہ رکھنا۔ دنیا میں کسی چیز کی طلب نہ رکھنا۔

نعمتیں، آسائشیں اور اسباب کی فراوانی انسان کو بے حس، مغرور اور اندھا بنا دیتی ہے۔ اس کے دل سے سوزِ قلب ختم ہو جاتا ہے۔ وہ دنیوی علائق میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ پھر اسے اپنی روح کی پرورش کی فکر نہیں رہتی۔ اس لیے اقبال نوجوان کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ مناصب و مراتب پر کیوں نہ پہنچ جائیں لیکن دل درویش ہی رہنا چاہیے۔

اقبال نے نوجوانوں کو خودی، عشق اور فقر اختیار کرنے کی جو تلقین کی ہے اس کے متعلق ڈاکٹر صدیق جاوید لکھتے ہیں:

> اقبال کے نزدیک خودی، عشق اور فقر ہی نوجوانوں کی صلاحیتوں کو صیقل کر کے انھیں قیادت اور امامت کے قابل بنائیں گے۔[vi]

فلسفہ عشق:

خودی، ایمان و یقین کی منزلوں تک پہنچنے کا ایک واحد راستہ عشق ہے۔ یہ عشق نہ صرف شخصیت کو نکھارتا اور پروان چڑھاتا ہے بلکہ عشق شاعری کو نت نئے مفہوم، افکار کی جولانی اور قوتِ تاثیر عطا کرتا ہے۔ اقبال خود بھی سحر خیزی کے عادی تھے اقبال کی خواہش ہے کہ جب سارا عالم خوابِ غفلت میں پڑا سو رہا ہو، اس آخر شب میں نوجوان اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوں۔ اقبال خود بھی سحر خیزی کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نوجوانوں میں اس آہ و سوز اور درد و تپش کو دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں اور بارگاہِ الٰہی میں دعا گو ہیں کہ یہ میرا سوزِ جگر اور میرا عشق آج کل کے مسلم نوجوانوں کو بخش دے

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق ، میری نظر بخش دے [vii]

اقبال کے نزدیک اگر نوجوان "لاالٰہ" کی رمز سے آشنا ہو جائے تو پھر اس کے سامنے بڑی

سے بڑی طاقتیں بھی کوئی اہمیت نہیں رکھیں گی اور وہ بلاخوف وخطر آتشِ نمرود میں کود جائے گا اور شہیدِ اعظم کی مانند کربلا میں جامِ شہادت نوش کر کے حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے لہٰذا الا اللہ کی بنیاد ہی عشق حقیقی پر ہے۔ یہی وہ فلسفہ عشق ہے جسے عاشقانِ الٰہی اور عاشقانِ رسول محسوس کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر آغا مبین "اقبال اور نژادِ نو" میں لکھتے ہیں:

> .....ہماری نوجوان نسل پیغمبر آخر الزمان رسولِ مقبول کے اسی آخری پیغام "لاالٰہ الا اللہ" کی رمز سے آشنا ہو کر اس پر عمل پیرا ہو۔ علامہ اقبال کے اس پیغام کو مشعلِ راہ بنا کر اسلام کے احیا اور پاکستان کے ارتقا کے لیے اگر تن من دھن اور جان و مال کی قربانی دینا پڑے تو ہر گز دریغ نہ کرے۔ پھر یقیناً مسلمانوں کی نوجوان نسل آنے والے زمانے کی امامت کر سکے گی۔[viii]

قرآنی تعلیمات:

اقبال کی زندگی پر کلامِ الٰہی جس قدر اثر انداز ہوا اتنا کسی شخصیت یا کسی کتاب سے وہ متاثر نہیں ہوئے۔ اقبال نے اپنے والد محترم کے حکم پر عمل درآمد کرتے ہوئے ساری زندگی قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرتے ہوئے گزار دیے۔ اس لیے اقبال نوجوانانِ ملت کو کلامِ الٰہی کو پڑھنے، سمجھنے، غور و فکر کرنے اور عمل کا مشورہ دیتے ہیں۔

قُرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جِدّتِ کردار [ix]

اقبال اپنے نوجوانوں کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

> قرآنِ حکیم ایک زندہ و پائندہ پیغام ہے یہ ان غلاموں کے لیے نہیں اُترا جو ہوا کے ہر رُخ پر اپنا رُخ بدل لیتے ہوں بلکہ ان جرأت مند دلوں کے لیے

نسخہ شفا بن کر اُترا ہے جو حالات کے دھارے پر بہنے کی بجائے انھیں بدل دینے کی ہمت رکھتے ہوں۔ قرآن حکیم کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا جب تک کہ انسان خود اس راستے پر گامزن نہ ہو جو اس کتاب نے بتایا ہے۔ یہ ان کتابوں میں سے نہیں جنھیں کسی کتب خانے کے خاموش اور پُر سکون ماحول میں بیٹھ کر پڑھا جائے اور لطف اندوز ہوا جائے۔ یہ تو عملی زندگی کے لیے رہنمائی کا ایک دستورالعمل ہے اس کے نکات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک کہ اس پر عمل نہ کیا جائے۔[x]

اقبال کی خواہش ہے کہ مسلمان نوجوان جو محکومیت کی ذلت میں گرفتار تھے، قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل کر کے ایک بار پھر آزادی و خود مختاری کی نعمت سے بہرہ ور ہوں۔ اقبال کو یقین ہے کہ اگر قوم کے نوجوان اپنے آپ کو بدل لیں تو مستقبل ایک بار پھر ہمارا ہو سکتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہی ممکن ہے جب مسلمان قرآنِ حکیم کے بحر ذخار میں غوطہ زن ہو کر اس کی فکر کے گہر آبدار چننے کی کوشش کریں جبکہ مسلمان نوجوانوں نے اس سے گہرے مفہوم کشید کرنے کی بجائے اسے طاق کی زینت بنا دیا ہے۔

قرآنی تعلیمات:

اقبال اپنے وسیع مطالعہ اور درست ذوقِ وجدان کی بنا پر اس امر سے آشنا ہیں کہ قرآن ہدایتِ انسانی کے لیے آخری صحیفہ ہے وہ کہا کرتے تھے کہ اگر انسان اس کا مطالعہ خشوع و خضوع سے کرے تو اس پر کائنات کے تمام اسرار و رموز واشگاف ہو جائیں گے۔ رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ قرآن کی عملی تفسیر ہے۔

عشقِ رسول ﷺ:

سیّد قاسم محمود "پیامِ اقبال بنام نوجوانانِ ملت" میں لکھتے ہیں:

عشق اقبال کی باطنی زندگی میں ارتقا پا کر عشقِ رسول ﷺ بن گیا ہے۔ جب وہ رسولِ کریم ﷺ کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا شعری وجدان جوش مارنے لگتا ہے اور اشعار خود بہ خود نعت کی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے محبت و عقیدت کے چشمے پھوٹے پڑے ہیں۔[xi]

اقبال بہت بڑے عاشقِ رسول ﷺ تھے۔ آنحضور ﷺ، مدینہ منورہ اور مجلسِ نبوی کا ذکر آتے ہی آنکھیں بھر آتیں بعض اوقات ہچکیاں بندھ جاتیں۔ مدینہ کا نام آتے ہی پیمانۂ عشق لبریز ہو جاتا اور اشکِ محبت رواں ہو جاتے۔ وہ حج یا عمرے کے لیے بے تاب رہے اگرچہ انھیں یہ سعادت جسمانی طور پر تو نصیب نہ ہو سکی لیکن انھوں نے "ارمغانِ حجاز" کے ایک باب بہ عنوان "بہ حضور رسالت ﷺ" میں آنحضور ﷺ کو مخاطب کر کے اپنی ذاتی وارداتِ قلب اور اُمتِ مسلمہ کی دل گداز تصویر پیش کی

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا ، لوح و قلم تیرے ہیں [xii]

تصورِ تعلیم:

اقبال افراد اور اقوام کی زندگی میں تعلیم و تربیت کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ انسان کی ساری زندگی کی عمارت اسی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے اور اقوام اپنے تعلیمی فلسفہ کے ذریعہ ہی اپنے نصب العین، مقاصدِ حیات، تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت کا اظہار کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے قومی زندگی کے اس اہم پہلو پر گہرا غور و خوض کیا اور اپنے افکار کے ذریعہ ایسی راہ متعین کی جو ایک زندہ اور جاندار قوم کی تخلیق کا باعث بن سکے۔ اقبال کے دور میں دو نظامِ تعلیم ملک میں رائج تھے ایک تو قدیم دینی نظامِ تعلیم تھا جو مذہبی مدارس میں رائج تھا۔ یہ صدیوں سے ایک ہی ڈگر پر چلا آ رہا تھا۔ وقت کے تقاضوں نے اس میں کوئی تبدیلی نہ کی اس کے باوجود یہ اپنی جگہ پر مکمل سمجھا جاتا۔

دوسرا نظام حکمران انگریز قوم کی فکر کی پیداوار تھا۔ اس کا مقصد نوجوانوں کو حصولِ علم، انتظامی مشینری میں مدد دینے کے علاوہ ایسی نسل تیار کرنا تھا جو اپنے ملک و قوم کی بجائے حکمران قوم سے وابستہ ہو۔ ان دونوں نظامِ تعلیم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو ملک اور قوم کی امنگوں اور مقاصد کی ترجمانی کرے اقبال نے ان پر بھرپور تنقید کی۔

اقبال نوجوانوں کے لیے ایسی تعلیم کے خواہش مند ہیں جو عقل و عشق کو خودی سے محکم کر دے کیونکہ عقل عشق کی وجہ سے حقیقت آشنا ہوتی ہے اور عشق عقل کی وجہ سے مضبوطی حاصل کرتا ہے جب عقل اور عشق دونوں اکٹھے ہوں گے تب ایک جہانِ نو کی تعمیر ہو گی۔ اقبال یہی پیغام اپنے نوجوانوں کو دیتے ہیں کہ اُٹھو نیا جہان پیدا کرو۔

اقبال کے تعلیمی تصورات یا فلسفہ تعلیم کے متعلق کتب و مقالات کی صورت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں تعلیم کے اصطلاحی مفہوم کی بجائے عام مفہوم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس میں درس و تدریس، تعلیم یا طلبہ و مدارس کے توسط سے پیدا ہونے والے مسائل کی بجائے انہی امور کی نشاندہی کی گئی ہے جو اقبال کے فکر و فن، فلسفہ خودی و بے خودی یا تصورِ فرد و جماعت کے حوالے سے کلامِ اقبال میں موجود ہیں۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی لکھتے ہیں:

> اقبال نہ تو فنِ تعلیم کے ماہر تھے نہ انھوں نے اس فن کی تحصیل کی تھی۔ نہ اس موضوع پر انھوں نے کوئی کتاب لکھی۔ بجز اس کے کہ کچھ مدت تک بحیثیت پروفیسر کالج میں درس دیتے رہے کوئی مستقل تعلیمی فلسفہ انھوں نے نہیں پیش کیا۔[xiii]

اقبال نے تعلیم کے فنی و عملی صورتوں پر غور کیا، مسائل تعلیم کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اپنے فلسفہ حیات میں مناسب جگہ دی۔ انھوں نے اپنے عہد کے نظامِ تعلیم پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی۔ صرف مشرق ہی نہیں مغرب کے فلسفہ تعلیم اور نظامِ کار کو بھی پیشِ نظر رکھا۔ دونوں کا موازنہ کیا

اور خرابیوں کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر سیّد عبد اللہ لکھتے ہیں:

> اقبال نے تعلیم کے عملی پہلوؤں پر کچھ زیادہ نہیں لکھا مگر ان کے افکار سے ایک تصورِ تعلیم ضرور پیدا ہوتا ہے جس کو اگر مرتب کر لیا جائے تو اس پر ایک مدرسہ تعلیم کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔[xiv]

مغربی تعلیم:

اقبال جدید مغربی تعلیم کے مخالف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "یہ تعلیم ہمارے نوجوانوں میں تعطل، جمود، آرام طلبی اور لذت کوشی پیدا کرتی ہے اور زندگی کو بحرِ منجمد بنا دیتی ہے۔ جدید مغربی تعلیم مغربی استعمار کا ہتھکنڈا بن کر مشرق میں اس کی تہذیب، اس کے افکار اور اس کے مستقبل کے لیے نو آبادیات کی زمین ہموار کرتی ہے اور نوجوانوں کو مغرب زدہ بناتی ہے اور بلند معیار زندگی اور اقتصادی ترقی کی ہوس پیدا کر کے نئے نئے مسائل سامنے لاتی ہے۔ مغربی تعلیم کفر و الحاد پھیلاتی ہے۔ ذہنی انتشار اور فکری الجھاؤ پھیلاتی ہے"۔

اقبال کی خواہش ہے کہ ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کا وجود ان کا ذاتی وجود ہو وہ یورپ اور امریکا کی پرچھائیں نہ بنیں ان کی مصنوعی زندگی مستعار نہ لیں۔ ان کا ذہنی ڈھانچہ ایسا ہو جسے مشرقی مسلمان معماروں نے تعمیر کیا ہو اس میں روح ہو، اس کی نگاہ میں خدا کا وجود مقدم ہو، یہ اسلامی طرزِ فکر و تعلم کو اپنائیں۔ اسلام کا جوہر ذاتِ باری تعالیٰ بلکہ اس کی توحید میں ہے۔ اگر ہمارے نوجوان کی تعلیم سے یہ نکتہ توحید موجود ہو وہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں اور عشقِ محمد ﷺ سے متصف ہوں۔

مغربی تہذیب علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کو حرفِ آخر تصور نہ کریں اگر نوجوانوں نے عروج حاصل کرنا ہے تو اپنی ہی تہذیب اور اپنے ہی وطن کی مٹی اور اپنے ہی علوم و فنون سے وابستگی پیدا کریں۔ مغربی تہذیب مصنوعی اور ناپائیدار ہے اور مشرق کے علم و فن اور تہذیب میں

وطن کی مٹی کی خوش بو رچی ہوئی ہے۔

مقاصد آفرینی:

مقصد کے ذریعے انسان اپنی سعی و عمل کی منزل کی جانب رواں دواں ہوتا ہے مقاصد کی بدولت ہی زندگی اک مرکزِ ثقل مستقبل کی جانب جھک جاتا ہے مقاصد آفرینی ایک ذہنی خصوصیت ہے، ذہنی زندگی جتنی اعلیٰ درجے کی ہو گی اسی قدر مقصد واضح اور معین ہوں گے۔ مقصد کی لگن کے لیے اقبال نے عشق کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ عشق جتنا سچا، گہرا ہو گا۔ مقصد کی لگن جتنی شدید ہو گی اتنا ہی انسان اپنے میں تسخیرِ فطرت کی صلاحیت پیدا کر سکے گا مقاصد آفرینی کے ساتھ عملِ صالح کی ضرورت ہے تاکہ حیاتِ انسانی کے امکانات واضح ہوں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان "روحِ اقبال" میں فرماتے ہیں:

> ..... بغیر عمل کے مقاصد چاہے کتنے ہی اعلیٰ و ارفع کیوں نہ ہوں، بے معنی ہیں۔ زندگی اپنے سارے بھید عمل کے آگے کھول دیتی ہے اور عمل میں بھی وہ سب سے زیادہ دور رس ہوتا ہے جو انسان کی اندونی زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔ خارجی عمل سے عالم میں تصرف ہوتا ہے اور اندرونی عمل سے انسانی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ انسان کو انفس اور آفاق دونوں ہی کو اپنے منشا کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ وہ عالمِ فطرت اور عالم نفس دونوں کے قوانین کا رمز شناس ہو۔[xv]

اقبال اور مسلم نوجوان:

اقبال کی نگاہ جب اپنی قوم پر پڑی تو انھیں ساری قوم ایک راہ گم کردہ قوم کی طرح دکھائی دی۔ اقبال دیدۂ بینا رکھنے والے شاعر تھے۔ اقبال خدائے بزرگ و برتر سے اُمتِ مسلمہ کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے دعا کرنے کے ساتھ ساتھ قوم کو درسِ عمل بھی دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر

کسی قوم کو میدانِ عمل میں لانے کی دعوت دینا ہو تو اس قوم کے نوجوانوں کو درسِ عمل دے کر خوابِ غفلت سے بیدار کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے نوجوان نسل کو بیداری کا پیام دیا انھوں نے ان نوجوانوں کا تقابل اپنے آباو اجداد اور اسلاف کے افعال و کردار سے کرتے ہوئے یہ احساس دلایا کہ ان کی رگوں میں ایسے خوددار اور باہمت آباؤ اجداد کا خون دوڑ رہا ہے جنھوں نے دنیا کی وقتی اور فانی شہنشاہیت کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔ جن کا شعار "اَلفَقرُ فَخرِیْ" تھا۔

اقبال نے نوجوان مسلمان کو اپنے آباؤ اجداد کی میراث حاصل کرنے کی دعوت دی کہ انھیں اپنے آباؤ اجداد کی میراث جو مثالی کردار و اعلیٰ اقدار پر مبنی ہے پھر سے حاصل کرنا ہو گی۔ انھیں آباؤ اجداد کی میراث تلاش کرنے کی دعوت دی جو یورپ کی لائبریریوں اور عجائب گھروں میں محفوظ ہے۔ اقبال نے برملا اس کا اظہار کیا:

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

ڈاکٹر آغا مبین "اقبال اور نژادِ نو" میں لکھتے ہیں:

> علامہ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ آج کی پاکستانی نوجوان نسل کو چاہیے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی اُس میراث کا، جو ہماری تہذیب و تمدن، علوم دینی و دنیوی اور اسلاف کے افکار و اقدار کا بہترین خزانہ ہے، گہرا مطالعہ کرے۔ یہ ہمارے بزرگوں کے وہی اقدار و افکار ہیں جن کا مطالعہ کر کے آج اہلِ یورپ ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں۔[xvi]

مصورِ پاکستان کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ نوجوان نسل کب اپنے آباؤ اجداد کی میراث حاصل کر کے آگے بڑھتی ہے اور کب وہ دنیا کی دوڑ میں ترقی کی منازل طے کر کے دستارِ فضیلت اپنے سر پر رکھتی ہے۔ اقبال نوجوان کو رنگ و نسل اور حسب و نسب کے بتوں کو توڑ کر محض ملتِ

اسلامیہ میں گم ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں اور قومی سرحدوں کو توڑ کر ملتِ اسلامیہ کی حیثیت سے ایک ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اقبال واقف ہیں کہ نوجوان کا دل درد اور تڑپ سے بھرپور ہے لہٰذا اقبال نے اس انگارۂ خاکی میں یقین بلکہ یقینِ محکم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں اپنی تقدیر بدلنے کے لیے اپنے اندر نگاہِ مومن کی تاثیر اور بازوئے حیدری پیدا کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ جب مسلم نوجوان میں ایثار و قربانی اور محبت و اخوت کا جذبہ ہو گا تو پھر قوم کی تقدیر بآسانی بدل سکتی ہے۔

اقبال عصرِ نو کا پیام بر:

عصرِ حاضر کے نوجوان نے اگرچہ فضاؤں کو تسخیر کر کے، خلاؤں میں اُڑنا سیکھ لیا، ستاروں پر کمندیں ڈال لیں لیکن قلبِ انسانی کو تسخیر نہ کر سکا۔ یہ نوجوان مادیت کے نشے میں گم اپنی دنیاوی کامیابیوں اور ایجادات کی بھول بھلیوں میں اتنا مصروف ہے کہ قلب و نظر کی دنیا سے کوسوں دور ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار "اقبال، ایک مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

> اب یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ سائنس کی ایجاد و ترقی عالم انسانی کی فلاح و بہبود کے کام اُسی صورت میں اور اُسی وقت آئے گی، جب مادیت کو روحانیت سے ہم آہنگ کر کے انفس و آفاق میں ایک خوشگوار توازن قائم کیا جائے گا۔ سائنس کو اس وقت لادین سیاست کی نہیں بلکہ مذہب کی دوستی و رہنمائی کی ضرورت ہے۔ یہی ایک ایسی راہ ہے جس پر چلنے سے انسان کی مادی ضروریاتِ زندگی کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور قلب و نظر بھی تسکین پا سکتے ہیں۔ انسان دھرتی پر سیدھے سبھاؤ بھی چل سکتا ہے اور افلاک پر بھی پرواز کر سکتا ہے یہی صراطِ مستقیم آج ہر اس شخص کے

پیشِ نظر ہے جو سچے دل سے عالم انسان کو مکمل تباہی اور ہلاکت و بربادی سے بچانا چاہتا ہے۔[xvii]

فرنگی تعلیم کے اثرات کا ایک مضر پہلو یہ ہے کہ وہ مفتوح قوم کے دل سے جذبۂ خود اعتمادی کو ختم کر دیتی ہے۔

نوجوانوں کے مثبت باطنی اوصاف میں خودی، ایمان، یقین، فقر، غیرت، عشق، عشقِ قرآں، عشقِ رسول ﷺ، مومن، شاہین اوصاف شامل ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وہ معاشرے کے مفید شہری بن سکتے ہیں۔

نئ قومی قیادت کا انحصار نوجوانوں کی درست تربیت پر ہے اگر کسی قوم کے نوجوان اعلیٰ کردار کے حامل، روشن دل و دماغ کے حامل اور احساسِ ذمہ داری کے مالک ہوں اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو صیقل کریں تو قیادت و امامت کے قابل بن سکتے ہیں۔ ایسی قوم کبھی انحطاط کا شکار نہیں ہوتی۔ اقبال ایک ایسے ہی جہانِ تازہ کے خواہش مند ہیں اس لیے وہ نوجوانوں کی ہمت بڑھاتے ہوئے انھیں نئے جہانوں کی تلاش کا مشورہ دیتے ہیں۔

نوجوانوں کے منفی ظاہری اوصاف جن پر قابو پانے کی ضرورت ہے ان میں مذہب سے دوری، کفر و الحاد اور لادینیت کا فروغ، علم سے دوری، جدید تعلیم کے مضر اثرات، مغربی تہذیب کے مضر اثرات، دینِ اسلام اور سچی تہذیب سے بے زاری شامل ہیں۔

قرآنِ حکیم جس حیات آفریں پیغام کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے مسلمانوں نے جب اس سے تغافل برتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ممالک مغربی استعمار کے شکنجے میں بری طرح پھنس گئے اور وہ ملتِ اسلامیہ جو تاریخِ عالم کی سب سے درخشاں تہذیب کی مالک تھی اب مغربی تہذیب کی چکاچوند سے متاثر ہو کر غلامی پر رضامند ہو گئی۔

دورِ حاضر کا مہذب نوجوان ہلاکت و بربادی کے کنارے پر کھڑا ہے۔ ابھی تک وہ اپنی نو

بہ نو ترقیات و ایجادات کی بھول بھلیوں میں بھٹکا ہوا قلب و نظر کی دنیا سے کوسوں دور ہے۔

مہذب قوموں کے نوجوان کمپیوٹر سے علمی تحقیق کا کام لیتے ہیں جبکہ ہمارے نوجوان سیلفی اور ٹک ٹاک میں مصروف ہیں۔ موبائل فون پر ایک دوسرے کے ساتھ چیٹنگ میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اقبال اس بات کو یوں فرماتے ہیں کہ

لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

اقبال کو شکایت یہ ہے کہ ان کی مخلصانہ نصیحتوں اور مشوروں پر کسی نے عمل نہیں کیا اور ان کے نخلِ علم کا کسی نے پھل نہ کھایا۔ انھوں نے شاعری میں جس سروشِ غیب کی ترجمانی کی اس پر کسی نے کان نہ دھرا۔[xviii]

ذہنی و عملی انقلاب:

اقبال ایک انقلابی مفکر تھے ان کے نزدیک انقلاب کی کشمکش سے بھرپور زندگی میں ہی قوموں کی بقا ہے جب کہ انقلاب سے محروم زندگی موت کا پیغام ہوتی ہے۔ زندگی کا یہ انقلاب ندرتِ فکر و عمل کا نتیجہ ہے ایسی ندرتِ فکر و عمل جو اپنی دنیا آپ تخلیق کرتی ہے۔ اقبال نوجوانوں کو ایک نئی دنیا کی تعمیر کی دعوت دیتے ہیں۔ اس دنیا کی تعمیر وہی کر سکتا ہے جس نے بقول اقبال دنیا کی قیادت کا علم سنبھالا۔ اقبال مسلمانوں کو اس امانت کا بوجھ اٹھانے کی دعوت دیتے ہوئے انھیں تیار کرتے ہیں یا کبھی اسلاف کے کارناموں کے حوالے سے کھوئی ہوئی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنے پر اُبھارتے ہیں کبھی مغرب کی تباہی کا حوالہ دے کر اور کبھی یورپ کے عالمی بگاڑ کا ذکر کر کے۔ اقبال کے نزدیک اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان بالخصوص نوجوان طبقہ عالمی قیادت کے لیے میدانِ عمل میں آئے، دنیا میں مثبت تبدیلیاں لائے اور قواعدِ ابراہیمی اور سنتِ محمدی ﷺ پر عمل پیرا ہو کر دنیا میں انقلاب برپا کرے۔

اقبال کی خواہش ہے کہ مسلمان نوجوان علم، عمل اور کردار کے ذریعے معاشرے میں

اپنا مقام پیدا کریں اور عزت و احترام کا مرتبہ حاصل کریں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ قدیم روایات کو ترک کر کے خود کو مثبت اور جدید جہتوں سے ہم آہنگ کریں تاکہ ترقی کر کے دوسری اقوام کے صرف دوش بہ دوش ہی نہ چلیں بلکہ ان سے سبقت لے جائیں اس طرح ان کا روشن ماضی عود کرے گا۔ اقبال نوجوانوں پر یہ حقیقت منکشف کرنا چاہتے ہیں کہ سائنس کی ایجاد و ترقی عالم انسانی کی فلاح و بہبود کے کام اُسی صورت میں اور اُسی وقت آئے گی جب مادیت کو روحانیت سے ہم آہنگ کر کے آفاق میں ایک خوشگوار توازن قائم کیا جاسکے گا۔ اقبال جہاں مستقبل کے آیندہ نقوش کی نشاندہی کرتے ہوئے نوجوانوں کو مستقبل کا امین سمجھتے ہیں وہیں وہ اس کی مطابقت سے نژادِ نو میں پوشیدہ یا ظاہری خصائل کی تربیت بھی کرتے ہیں تاکہ وہ اس ذمہ داری کے اہل ہو سکیں۔

مفکرِ اسلام کے مؤثر کلام نے جس طرح برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے دلوں کو گرما کر انھیں غلامی کی آہنی زنجیروں سے آزاد دلائی، اسی طرح اقبال کا کلام حکیم ملت ہونے کی حیثیت سے تمام دنیائے اسلام کے لیے شمعِ ہدایت ہے۔ اقبال اگرچہ عصری حادثات و انقلابات سے بھی متاثر ہوتے رہے لیکن ان کی نگاہ مسلمانوں کے شاندار ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل کے امکانات پر بھی رہی اور عصرِ نو کا استقبال ان کی فکر و نظم کا مرجع بن گیا۔ یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی ایک بالغ نظر مفکرِ اسلام کی حیثیت سے کی ہے یہی وجہ ہے کہ افکارِ اقبال عصرِ حاضر میں بھی مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اقبال کی شخصیت، افکار، نثری و شعری تحریروں کا بنیادی موضوع اور مخاطب نوجوان نسل ہے۔ انھیں اگر کوئی امید ہے تو انھی سے ہے کیونکہ نوجوان نسل میں وہ روحانی قوت موجود ہوتی ہے جو انھیں جدوجہد، محنت و مشقت اور تخلیق و حصولِ علم کے قابل بناتی ہے۔ آج قوم کو اپنے نوجوان کی ہمت اور ارادے کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے اس لیے اس دور میں اقبال کی شاعری کی اہمیت اور ضرورت بھی دوچند ہو گئی ہے۔

حوالہ جات

i مشمولہ "تعلیماتِ اقبال"، از اسلم ملک، علامہ اقبال فاؤنڈیشن سیال کوٹ، ۱۹۸۸، ص ۱۷۶۔

ii علامہ محمد اقبال: 'کلیاتِ اقبال'، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۱۴، ص ۱۱۱۔

iii ایضاً ص ۲۴۶۔

iv انعام الحق کوثر: اقبال سے چند خوشے، سیرت اکادمی بلوچستان، ۱۹۹۴، ص ۳۳۔

v محمد عبد اسلام خان: افکارِ اقبال، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، ص ۱۱۱۔

vi ڈاکٹر صدیق جاوید، "بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ" یونیورسل بکس لاہور، ۱۹۸۹، ص ۲۱۸۔

vii علامہ محمد اقبال: "کلیاتِ اقبال"، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۱۴، ص ۱۲۲۔

viii ڈاکٹر آغا مبین: اقبال اور نژادِ نو، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۶، ص ۷۵۔

ix علامہ محمد اقبال: "کلیاتِ اقبال"، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۱۴، ص ۴۹۵۔

x محمد حامد: "افکارِ اقبال"، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۶، ص ۱۰۔

xi سیّد قاسم محمود: "پیامِ اقبال بنام نوجوانانِ ملت"، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۹، ص ۱۳۹۔

xii علامہ محمد اقبال: "کلیاتِ اقبال"، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۱۴، ص ۱۶۲۱۔

xiii محمد خاں: "اقبال اور مسئلہ تعلیم"، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۷، ص ۵۶۔

xiv شاہوار بیگم: "بچوں کے ادب میں اقبال کا حصہ"، اردو پبلشرز لکھنؤ، ۱۹۸۶، ص ۷۹۔

xv ڈاکٹر یوسف حسین خاں: "روحِ اقبال"، مکتبہ تعمیرِ انسانیت لاہور، ۲۰۱۶، ص ۱۲۸۔

xvi ڈاکٹر آغا مبین: "اقبال اور نژادِ نو"، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۶، ص ۸۰۔

xvii ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: "اقبال، ایک مطالعہ"، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۹۷، ص ۱۳۷۔

xviii سیّد قاسم محمود "پیامِ اقبال بنام نوجوانانِ ملت"، اقبال اکادمی لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۹، ص